ڈاکٹر محمد رؤف

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد

ڈاکٹر عدنان احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف جھنگ، جھنگ

ڈاکٹر ایم ریاض احمد ریاض

شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد (وزٹنگ)

''اینیمل فارم'' (از: جارج آرویل) کے دیباچے پر ایک اظہاریہ

PREFACE TO "ANIMAL FARM" (BY: G. ORWELL): AN EXPRESSION

Abstract

"Animal Farm" by George Orwell is a thought provoking novel of twentyth century but the preface to this novel has much more to pounder upon.Apparantly it throws light on the in-built short comings of a perticular thinking pattern by one of its own minds.On the other hand,the very pregnant text alludes the reader to interpret and analyse it in line with capitalistic project of reform or in resistance to the naratives of colonial masters because the metaphorical narration of language does not accepts the authoritative pressure of its masters.This essay seeks to offer a non-formal reading of the said preface and foregrounds one of its connotational perspectives out of this muti-dimentional dicourse.

Keywords:

Goerge Orwell, Discourse, Ruling Narrative, Coloniser, Colonised, Capitalism, Communism, Animal hypnatism, Sir Syed, Maulana Moududi, Natural dignity parameter, Animal metaphors, material dilectics, Way forward.

جارج آرویل نے اپنے تمثیلی ناول جانورستان (Animal Farm) کے ذریعے مارکسی فلسفے کی نارسائیوں کا منظر نامہ بخوبی تلفیظ کیا مگر چوتھی دنیا[1] کی کارگاہوں میں جب ایسے مناظر تجسیم کیے ملتے ہوں تو مغربی دریچوں پر تانک جھانک کے معنی کیا؟ خدا رکھے ہمارے اپنے اینیمل فارم کیا کچھ کم دیدنی ہیں کہ غیروں کے معدن کھدائی کیے جائیں۔ مژگاں کھول کر دیکھیے کہ سامری کی مقدس گائے کا بچھڑا جینیاتی انجینئرنگ کی بدولت

گوشت خور ہو چکا۔ وحشت زدہ گدھے جانورستان میں دولتیاں جھاڑتے ہیں۔ اِدھر ناقۂ بے زمام نے گھُورے کی گھاس نگلی(۲) اور دیارِ حرماں سے گریزاں ہوئی جاتی ہے۔ لگڑ بگوں نے زرد کتوں سے گٹھ جوڑ بنایا اور روئے زمیں پر پھیل گئے۔ الغرض لمحۂ موجود میں ہمارے یہاں افلاطون کے سماجی حیوان کی سینکڑوں قسمیں قلبِ ماہیت کیے ملتی ہیں۔ علامتوں کی تجدید کا سلیقہ ہو تو عہدِ رواں میں جدید پنج تنتر، منطق الطیر اور مثنوئ معنوی کے سیکوئلز ادبیانے کے سامان فراواں ہیں؛ اڑچن مگر یہ کہ اس کے لیے روایت سے تخلیقی تعامل روبہ عمل لانا پڑتا ہے اور فی زمانہ روایتی شعور کی ارزانی معلوم۔ ایسے میں علامہ اقبال کو بجا طور پر حسرت رہی کہ عجم کے لالہ زاروں سے پھر کسی رومی کے اٹھنے کا سمبندھ نہ ہو پایا اور انتظار حسین یہ کہہ کر علامتوں کے زوال کا مرثیہ کہتے رہے:

> ''جب کسی زبان سے علامتیں گم ہونے لگتی ہیں تو وہ اس خطرے کا اعلان ہے کہ وہ معاشرہ اپنی روحانی وارداتوں کو بھول رہا ہے۔''(۳)

مذکورہ ناول ایک معمول کی تمثیل ہے جس میں کسی فارم کے جانور اپنے مالک افراد سے بغاوت کر کے حکومت خود اختیاری قائم کر لیتے ہیں۔ اس چوپایہ سماج میں سات اصولوں کو سماجی ضابطۂ کار کے طور پر اپناتے ہوئے تمام حیوانات کو مساوی حقوق کی ضمانت دی جاتی ہے۔ یہ اشتراکی نظامِ حیات اس وقت مگر تیزی سے زوال پذیر ہونے لگتا ہے جب ان کا سردار یعنی سوَر اپنے لیے ممتاز حیثیت کا جواز یہ کہتے ہوئے تلاشنے کی سعی کرتا ہے:

> "All animals are equal,but some animals are more equal then others."(4)

اس طرح یہ نو متعارفہ نظام پھر سے اپنے روایتی چلن کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جوہر آئینہ بھی آئینے سے نم کھینچتا ہے۔ یہ ایک سطری بیانیہ فلسفۂ اشتراکیت کی اس جوہری خرابی (Manufacturing Fault) کا غماز ہے جو انسانی نفسیات کو نظر انداز کرنے سے نم کھینچتا اور آکاس بیل کی طرح پھیلے چلا جاتا ہے۔ یہاں رولاں بارتھ کے معروف مضمون ''The Pleasure of the Text'' کی ایک لائن پیش منظر پر ابھرتی ہے:

> "Is not the body's most erotic zone there where the garment leaves some gapes."(5)

مذکورہ ناول میں بلاشبہ ادبی اقدار کا بخوبی اہتمام کیا گیا ہے مگر اس فن پارے کی عالمی شہرت میں ادبی سے زیادہ نظریہ پرستی کی حرکیات کا عمل دخل کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ دراصل یہ ناول سوویت سوشل ازم پر ایک گہری طنز ہے۔ یہاں بوڑھے میجر، نپولین اور سنو بال کے کردار بالترتیب کارل مارکس، اسٹالن اور ٹروٹسکی کے حیوانی روپ ہیں۔ ناول کا آخری جملہ نہایت معنی خیز ہے:

"The creatures outside looked from pig to man,and from man to pig,and from pig to man again;but already it was impossible to say which was wich."(6)

واضح رہے کہ مشرق و مغرب کی داستانوی شعریات کے تقابلی تناظر میں استنباطِ نتائج کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید احمد نے اپنی کتاب داستانیں اور حیوانات میں ایک دلچسپ نکتہ کچھ اس انداز میں ابھارا(Foregrouding) ہے کہ بقولِ داغؔ: بات کی یوں کہ جیسے کی ہی نہیں؛ لکھتے ہیں:

مشرقی داستانوں میں انسان اکثر اوقات حیوانات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ قلبِ ماہیت زوالِ آدمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مغربی کہانیوں میں بسا اوقات معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ یہاں مختلف جانور درجۂ حیوانیت سے گر کر آدمی کی جون اختیار کر لیتے ہیں۔(۷)

یہاں پسِ پردہ حقائق یہ ہیں کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد وہاں مروج ہونے والے اشتراکی نظام حیات سے سرمایہ دارانہ طرزِ فکر کے حامل لوگ بہت خائف تھے، لہٰذا انھوں نے اس فلسفے کی ممکنہ خام کاریوں کو پیشین گوئی کے طور پر فنونِ لطیفہ میں بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ سے سرد جنگ کی کھینچا تانی میں گمان کے امکانات روشن ہو چلے اور ادبی اندازے ٹھیک بیٹھے تو عالمی سیاست کی بساط پر دائیں بازو کے قمار بازوں نے ترپ کا پتہ کھیلا اور ایک مہابیانیہ تشکیل کرتے ہوئے اسی ضمن میں مذکورہ ناول کو انگریزی ہی کیا جملہ عالمی زبانوں کے افسانوی ادب میں بھی ممتاز قرار دے ڈالا جو بعض دقیقہ رس ناقدین کی نظر میں بجا طور پر متنازعہ ٹھہرا۔ اس فلسفیانہ شطرنج کی بساط پر ادبی شعریات سیاسی و ثقافتی اجارے کی حرکیات سے بخوبی مملو تھیں۔ امریکی اور یورپی دانش گاہوں سے ایسا منصوبہ بند ادب بعد ازاں فیوچر شاک(۱۹۷۰ء)، دی تھرڈ ویو(۱۹۸۰ء)، پاور شفٹ(۱۹۹۲ء)، تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی(۱۹۹۲ء)، تہذیبوں کا تصادم(۱۹۹۴ء) اور دی ہالو کاسٹ وغیرہ جیسی کتب کی صورت ایک مخصوص کلامیے(Discourse) کی تشکیل کاری کے ضمن میں سامنے آتا رہا۔ واضح رہے کہ میشل فوکو نے کلامیے ہی کو طاقت ہتھیانے کا سب سے کاری حربہ قرار دیا ہے۔ ایسی علمی و ادبی کاوشوں میں برطانوی فلسفی جرمی بینتھم کی افادیت پسندی(Utalitarianism) کے آثار بھی قدرِ مشترک کے طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ طرفہ تماشا مگر یہ کہ ترقی پسندوں کے نامۂ سیاہ کی تیرگی سرمایہ دار دوشیزہ کی زلفوں میں پہنچتے ہی حسن کہلانے لگتی ہے۔ کسی کی مقصدیت پروپیگنڈا ہے اور کسی کا پروپیگنڈ بھی عین ادبیت؛ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!! ایک شاعر پہ مگر اسرار کھلتا ہے:

سودائے عشق اور ہے ،وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا(8)

اس ناول کا دیباچہ ہمارے لیے مگر ''چیزے دیگری'' کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس میں مذکور فکر و فلسفہ کے نظر انداز شدہ نظارے ''ادب کا عالمی دریچہ'' کھولنے والے ڈاکٹر امجد طفیل کی وساطت سے دھیان پڑے ہیں۔ مذکورہ دیباچے کی جسارت آفریں تسطیر اور اشاعتی ممنوعیت میں مغربی سماج کی تخلیقی نمو اور اقداری تردّدات کا ایک سربستہ راز مخفی ہے۔ شاید ۱۹۴۵ء میں ناول کی اشاعت اوّل کے بعد دیباچے کا اگلی کئی اشاعتوں میں شامل نہ کیا جانا بھی اسی راز داری کا ہی ایک شاخسانہ تھا۔آخر الامر اسرار یہ کھلا کہ آٹھ صفحات کے مذکورہ دیباچے میں مصنف نے اپنے ملک کے آزاد منش دانش وروں کو وفاداریوں کے غیر مشروط سمجھوتوں پر تنقید کا نشانہ بنایا تھا:

"It is the liberals who fear liberty,and the intellectuals who want to dirt on the intellect: it is to draw attention to that fact that I have written this preface."(9)

یہاں مصنف نے برطانوی دانش وروں کی نفسیاتی تہوں کو بھی طشت از بام کیا ہے کہ کیوں کر وہ سرکاری انتباہ کی عدم موجودگی میں بھی خود اختیاری سنسر شپ کے اسیر ہو کر حقائق کو مسخ کیے دیتے ہیں۔ جدید ریاستیں قومی بیانیے کی تشکیل میں فکری یک جہتی کو بنیادی اہمیت دیتی ہیں۔آزادانہ فکر و نظر پر ایسی بیانیہ سازی کی فضا میں البتہ بٹہ ضرور لگتا ہے۔اس وقیع دیباچے میں برطانیہ جیسے اظہارِ رائے کی آزادی کا بلند بانگ دعوٰی رکھنے والے ملک کا باطنی تضاد دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میکدے پر پیغمبری افتاد پڑے اور میکشانِ خام کار ناؤنوش سے ہاتھ کھینچ لیں تو ایسے میں کارکنانِ قضاو قدر شیشے کے اکرام اور مے کی تکریم کے لیے پختہ کار رند خراباتی کا اہتمام کرتے ہیں اور جب کہیں عالمِ جبر کے ایوانوں میں صدا کا قحط پڑتا ہے تو انھی شوریدہ سروں کے گوشۂ لب سے نعرۂ مستانہ بلند ہوتا ہے۔ فکر و نظر کا ایسا ہی تنوع کسی معاشرے کی سماجی گھٹن کا حقیقی علاج ہے۔

مذکورہ دیباچے کے مندرجات میں بھی قوم پرستانہ مرکزی فکری دھارے (Main Streem Ideology) سے ہٹ کر حاشیہ آرائی کی ایسی ہی جرأتِ رندانہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ بات بطور خاص نمایاں کرنے کی نہیں کہ آزادہ روی کے ایسے منطقے غیر آباد کبھی بھی نہ رہے تھے کہ فی زمانہ سارتر، نوام چومسکی اور جولین اسانج کی وجۂ شہرت بھی ایسا ہی ''خلل ہے دماغ کا''۔اتفاقاتِ زمانہ سے ایسی افتاد البتہ ضرور پڑتی رہی ہے کہ چمن

میں اس نوع کے جنوں پیشہ سینہ چاکانِ چمن کم یاب تو کیا نایاب ہو گئے جس پہ مرثیہ تلفیظ کرتے ہوئے میرؔ نے اپنی آہ و بقا میں بجلیاں پیس کے بھر دی تھی:

مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں
تھا جن سے لطفِ زندگی وے یار مر گئے(10)

اسی صداقت شعار خانوادے کی کڑی ارون دھتی رائے جیسی ''زنِ ہندوئے'' کی خدمت میں دوزانو بیٹھنا چاہیے کہ ''درندے کی پہچان'' کروانے میں ہیٹی نہیں رہتی۔ احمد عقیل روبی نے جنگل کتھا کی شروعات کسی گمنام شاعر کے ایک مصرعے سے کی تھی جس کا ترجمہ ہے: ''اگر پرندے اور جانور تخلیق نہ ہوتے تو ہم سچ کس کے منہ سے کہلواتے۔''(11) رعایتِ شعری کے تقاضے بجا، ورنہ ہمارے پاس سچ کی ترجمانی کے لیے ثنویت نہیں تثلیث کا وجود ہے: پرندے، بچے اور رندانِ باصفا۔ اردو غزل جسے مقامی سماج سے اٹوٹ انسلاک کے پیشِ نظر ہمارا '' تہذیبی عرف''اور'' ثقافتی نسب نامہ'' جیسے امتیازی القابات سے یاد کیا جاتا ہے، فقیہانِ مصلحت بیں اور علمائے سو کے مقابل مقدس خمار کے حامل ایسے ہی بادہ خواروں کی ستائش کا قابلِ فخر اثاثہ رکھتی ہے۔ سماجی حقیقتوں کا بے خطر و مصلحت اظہار کرنا اور ایسے حقائق کے لیے شیوۂ تسلیم کی خُو اپنانا مئے دو آتشہ کو رگ و پے میں اتارنے کے جیسا مشکل معرکہ ہے مگر اقوام و ملل کی عظمتیں اسی نوع کی رسمیاتِ میکدہ سے ماپی جاتی ہیں۔ سُقراطی فلسفے کی ساری بنیاد اسی صداقت کا سبق پڑھنے اور تعمیل نے پر استوار تھی جسے بعد ازاں نبی آخر الزماں ﷺ کے پیروکار اسلامیوں نے مزید موثر بنایا اور حضرت جعفر طیارؓ کے جیسے بے خوف عاملینِ صداقت پیدا کر کے قوموں کی امامت کی؛ فی زمانہ مگر تثلیث کے فرزند اپنے امتیازی وصف کے طور پر جس کے لیے دعویدار ہیں۔ عالمی گاؤں میں دیارِ مغرب آج کوئی دور دیس کی بستی نہیں رہی۔ سماجی اخلاقیات کے حوالے سے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ ۲۰۲۱ء دیکھ کر دل سیپارہ ہوا جاتا ہے کہ سچائی، عدل و انصاف اور مساوات کے حوالے سے دنیا کے شفاف ترین ممالک میں کسی مسلمان ملک کا شمار نہیں۔ ڈنمارک، فن لینڈ اور سویڈن جیسی سرزمینوں پر سیکولر اخلاقیات کی گھنی چھاؤں لکشمی اور سرسوتی کو بیک وقت لبھاتی اور شیر و شکر ہونے پہ مجبور کیے جاتی ہے۔ ایشیا اور افریقہ سے سرمایہ و محنت باہم کنگلیاں کیے ہنستے کھیلتے چلے آتے ہیں۔ آج حریمِ ہوس پہ دولتِ حسن کی برسات ہے اور عشق پیشہ کرنے والوں کے کاسے میں نظرِ غلط انداز بھی ارزاں نہیں ہوتی تو اس کی کچھ وجہ تو ہو گی؟ اس ضمن میں مولانا مودودی گویا ہوتے ہیں:

''انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، انھی کو وہ (خدائے متعال) یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔۔۔ پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا ہیں۔ جب تک ان کا بناؤ، ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں ہوتا اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے تمام قصوروں کے باوجود، دنیا کا نظام انھی کے سپرد رہتا ہے، مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انھیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔(12)

یہاں ہمیں دعوتِ فکر ملتی ہے کہ ہندوستانی اقوام: ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ مذکورہ سنتِ خداوندی کے حوالے سے کن صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بنا پر امورِ مملکت پر فائز ہونے کے دعوے دار ہو سکتے ہیں تو خاصی مایوسی کی فضا بنتی نظر آتی ہے۔ مسلم قوم نے گذشتہ کئی صدیوں تک قوموں کی امامت کے فرائض بڑی آن بان سے نبھائے اور فلاح و اصلاحِ انسانیت میں بھرپور کردار ادا کیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ آج یہی قوم اقوامِ عالم کی صفوں میں کہاں کھڑی ہے؟ فی زمانہ شعائرِ اسلام کی تشویق و ترویج میں بھرپور سرگرمی دکھائی جا رہی ہے، اسلامی تہواروں میں عوامی دلچسپی کا گراف تیزی سے بڑھا ہے، تعلیماتِ قرآن و سنت کے ضمن میں مواصلاتی ذرائع کے ذریعے تبلیغی انقلاب روبہ عمل ہے؛ گویا اسلامیانِ عالم کی مذہبی شیفتگی اور روحانیت آمادگی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے؛ ایسے میں خورشید ندیم کی شاخِ فکر پر ایک سوال کا آکھوا مگر گولر کے پھول کی طرح دھیرج سے یوں پھوٹتا ہے: ''کیا سبب ہے کہ اسلام کے ساتھ ہماری والہانہ وابستگی، اجتماعی اخلاقیات پر اثر انداز نہ ہو سکی؟''(13)

علامہ اقبالؒ، خدا حشر میں ہو مددگار ان کا، ملّائیت کی تردید میں عمر بھر یہی آشوبِ آگہی منظوم کرتے رہے کہ توحید جیسی انقلابی قوت کو خرقۂ سالوس میں لپیٹے مہاجنوں نے محض علم الکلام کا خالی خولی مسئلہ بنا کر رکھ دیا۔ ''تفو بر تواے چرخِ گرداں تفو''!! مذہبی تعبیر و تشریح کے اختلاف سے مسلکی منہاج کا تنوع تو سمجھ میں آتا ہے، یہ فرقہ واریت کی بڑھتی انفیکشن کیا معنی؟ یہ محض نظریہء پاکستان کی مسخ شدہ تعبیریں اور بانیانِ ریاست کے فکری استحصال کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ خورشید احمد ''ادبیاتِ مودودی'' کے صفحہ ۱۵۸ پر رقم طراز ہیں:

''جس طرح عداوتوں میں سب سے زیادہ خطرناک عداوت وہ جو دوستی کے پیرائے میں کی جائے اسی طرح گمراہیوں میں سب سے زیادہ خطرناک وہ گمراہی ہے جو ہدایت کے لباس میں جلوہ گر ہو''(14)

لاالہ الااللہ کے سدید منشور پر بننے والی مملکت میں کلیم اور الاٹمنٹ کے دھندے زمینوں جائیدادوں کی خرد برد تک محدود نہیں رہے، تاریخ، تہذیب اور عقائد پر بھی کئی گرہیں لگائی گئیں جو پرکھوں کا سینہ سالنے کو کافی ہوں گی۔ فیروز پور سے ایک ہجرت کار بزرگوار کے زنگ آلود ٹرنک میں RL-2 کے مٹیالے کاغذوں پر گیارہ سو کینال زمین کا بقیہ ماندہ ریکارڈ خستہ ہو کر ناقابلِ شناخت ہو چلا تھا مگر چک ٹکواڑہ، موضع حسن زئی، تحصیل کلاچی، ڈیرا اسماعیل خاں کے قبائلی عمائدین بالخصوص عنایت اللہ خاں گنڈاپوری کے بنام اس کی جائیداد کا تنازعہ آج تک حل نہ کرایا جاسکا اور ادھر مدعی وطن کی گلیوں پہ جاں نثاری کرتے ہوئے کشن پورہ کی خاک میں منڈکری سی مار سو رہا۔ یہ ملکِ پاکستان میں دینِ حنیف کی ایسی من پسند اور جمہوریت دشمن تعبیروں پر وہی سرمایہ پرست اذہان اصرار کیے جاتے ہیں کہ بقول ڈاکٹر انوار احمد: ''جو برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے، یہ اور بات کہ اس برہما کو جی ایچ کیو میں اسمبل کیا گیا تھا۔''(15) یقیناً توبہ کے لمحات ہیں مگر واحسرتا کہ توفیقِ عمل کی مناجات ہمارے کٹھور سینوں میں ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں۔ یا حسرتاً علی العباد۔۔۔

یہاں ڈاکٹر امجد طفیل کے ادبی کالم ''دریچۂ عالم'' کا وہ استنباطی نکتہ یاد آتا ہے جو انھوں نے مذکورہ دیباچے کی اردو اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے ماحصل کے طور لکھا تھا: ''یاد رکھیں! کسی بھی فرد کو لکھنے اور کہنے کی اتنی ہی آزادی ملتی ہے، جتنی وہ اپنی ہمت اور استطاعت سے حاصل کرتا ہے۔''(16) آمدم بر سرِ مطلب، اب ذرا اسی تناظر میں آرویل کا یہ تجزیہ دیکھیے جس میں انھوں نے اخلاقی متانت شعاری اور اختلافِ رائے کو برداشت کرنے جیسی اقدار کو اپنے ملک کا شناختی تشخص بنا کر پیش کیا ہے:

> "Tolerance and decency are deeply rooted in England, but they are not indestructible and they have to be kept alive partly by concious effort."(17)

اس سادہ سے جملے کو محض سادہ سمجھنا بذاتِ خود سادگی ہوگا کہ یہاں سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی سبز گھاس میں کیموفلاج کیے بیٹھے سنپولیے کی طرح محوِ کار فرمائی ملتی ہے۔ یہی وہ مقتدر بیانیہ ہے جس سے ڈسکورس کی مسمریز کے خدوخال متشکل ہوتے ہیں۔ توپ و تفنگ سے اقوام یرغمال بنتی ہیں تو شعر و ادب اور فکر و فلسفے سے انھیں سدھانے کی سبیل بھی کی جاتی ہے۔ یادش بخیر، سرسید احمد خاں جنھیں جنگِ آزادی کے مابعدی منظر نامے میں بجا طور پر مسلمانوں کا ''پولیٹیکل خضر'' مانا جاتا ہے، شعوری یا لاشعوری طور پر ایسے ڈسکورس کے متاثرین ضرور رہے تاہم بجا طور پر ان کا ''بناؤ'' ان کے ''بگاڑ'' سے کہیں بڑھ کر تھا۔ آپ کی ایک تحریر ''جوتے کا مقدمہ'' کا اختصاریہ یوں ہے کہ ایک انگریز جج نے سزا کے طور پر بھری کچہری میں کسی ہندوستانی کو جوتے سر پہ رکھے کھڑے رہنے پر مجبور

کیے رکھا جس پر آپ نے احتجاج کرتے ہوئے لکھا: ''ایسی سزاؤں کا اپنی طرف سے جاری کرنا جن کے وہ قانوناً مجاز نہیں ہیں انگریزی عدالتوں کی تہذیب اور انصاف میں سراسر بٹالگانا ہے۔''(18) حالانکہ یہ ایک کھلا راز ہے کہ ''کالا لوگ'' کے حصے میں مقامی گماشتوں جیسے کراماً کاتبین کی تسطیر کردہ ''پکی رپورٹوں'' پر بالعموم ''دوسری'' قسم کا انصاف آتا رہا ہے۔ یہاں اکبر الٰہ آبادی کے ایک خود ساختہ ''نکتہ ءموزوں'' کی شنید کا محل ہے:(18)

نکتہ: اصحابِ پارلیمنٹ اور اربابِ کونسل بڑے روشن خیال انصاف دوست اور خوش خصال ہیں مگر حکامِ ضلع جن سے ہمیں سروکار ہے ایسی عمدہ صفات سے عاری ہوتے ہیں۔

متنی تشکیل:

عرش پر نورِ الٰہی جلوہ گر ہے ہم کو کیا
اہلِ دنیا کو تو فیضِ مہرِ انور چاہیے

اشجار میوہ دار ہیں اس باغ میں تو ہوں
مجھ کو نصیب کچھ بھی نہیں سیر کے سوا

اسی طرح سرسید کی ایک تحریر ''بچہ کشی کی عجیب واردات'' میں پارسی عورت کے ہاں کسی یورپی شخص کے ناجائز بچے کی پیدائش اور بعد ازاں ''مجرم'' ماں کی طرف سے نومولود کے ''بے رحمی'' سے قتل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ''ہم کو معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی یورپین صاحب سے پیدا ہوا تھا۔۔۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس کا نام شائستگی کا نتیجہ رکھا جاتا جو نہایت موزوں نام ہوتا۔۔۔ یہ بھی افسوس ہے کہ ایک یورپین صاحب کا بچہ ضائع ہو گیا اور اگر وہ زندہ رہتا تو کیسا لائق اور عالی دماغ ہوتا۔''(19)

کچھ اسی طرح کلونیل عہد کے ادبی سرمائے میں مقامی باشندوں کے لیے حیوانی استعارے کنایے کا استعمال اور صاحب لوگوں کے مقابل انھیں کریہہ الخلقت اور فاتر العقل جانور ٹھہرانا اتنا عام رہا ہے کہ اسے بطور خاص نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل نوآبادیاتی باشندوں کی خود ترحمی اور مرعوبیت کا یہ تمام تر عمل ''Tolerance and Decency'' جیسی اکتسابی صفات کو اپنے ساتھ اٹوٹ طور پر جوڑتے ایسے ہی مقتدر کلامیوں کا تلخ ثمرہ تھا جسے شو گر کوٹ کر کے نوآبادیوں کی فکری رگ وریشے میں اتار دیا گیا تھا اور زیرِ نظر دیباچے میں جس کے آثار بہ آسانی نشان زد کیے جا سکتے ہیں۔

حیلہ دار سرمایہ دار کی مشتہر کردہ حقیقت پسندانہ فضا میں یہ سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اس اہم ناول کو برطانوی اشاعتی ادارے بار بار فخریہ شائع کرتے رہے مگر ابتدائی اشاعت ۱۹۴۵ء کے بعد اس کا دیباچہ چھپنے

نہ دیتے تھے، کیوں، کیوں، کیوں؟ معاملہ یہ کھلا کہ دوسری جنگ عظیم میں اشتراکی فلسفے کا حامل و عامل متحدہ روس سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے اتحادیوں یعنی برطانیہ، امریکہ اور فرانس جیسے ممالک کی حمایت میں جرمنی، آسٹریلیا اور ترکی وغیرہ کے خلاف جنگ کا سا جھی تھا، لہٰذا نظریۂ ضرورت کے تحت برطانوی پبلشر زاشتراکی طرزِ حیات پر گہری طنز کے حامل اس ناول کو چھاپنے میں تذبذب کا مظاہرہ کرتے یا مشروط طور پر آمادہ ہوتے تھے، کہ مبادا ان حالات میں روسیوں کو خفگی کا بہانہ ہاتھ آئے۔ یوں آزادئ اظہارِ رائے کا بنیادی اصول مصلحت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

مصنف برطانوی اشرافیہ کی اس کوتاہ اندیشی کے نادیدنی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے بھرپور احتجاج کرتا اور ایسی اُتھلی مصلحت کاری کو طبقۂ دانشوراں کی بزدلی (Intellectual Cowardice) قرار دیتا ہے۔ اسے یہ بات بڑی ناگوار گزرتی ہے کہ فکر و فلسفہ کے متانت سرشت (Fair-minded) برطانوی حلقے ایسی گھمبیر فکری پسپائی کو اپنے علمی ڈسکورس کا حصہ نہیں بنا رہے جس سے ملک میں حقائق کی دانستہ تکذیب (Deliberate Falsification of Facts) کی زوال آمادہ فضا سازی کا قوی احتمال تھا۔ یادش بخیر! امام غزالی نے ایک جگہ نظامِ عالم کو درہم برہم کرنے والی تین بنیادی وجوہات کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ایک عالم کی غلطی ہے۔ یہی فکر انگیز تنبیہ عربی لوک دانش میں ''موت العالِم، موت العالَم'' کی صورت تسطیر ہوئی ہے۔ کبھی یہ نکتہ اسلامیوں کی پہچان تھا مگر آج اسے مغربی اقوام کا اقداری تشخص جانا جاتا ہے۔ یہ الگ قضیہ ہے کہ سرمایہ دار دانش وروں کا اشتراکی فلسفے کے مقابل تیار کردہ تمام تر تعقلاتی فریم ورک بودا نکلا۔ فوکویاما نے مغربی طرز کی لبرل جمہوریت کو ریاستی نظم و نسق کی معراج قرار دیتے ہوئے تاریخ کے خاتمے کا اعلان کیا تھا مگر مشرق سے نکلتا ہوا سورج ہمالہ کے چشمے اُبلنے کی از سرِ نو نوید سنائے جاتا ہے۔ سرد جنگ میں مملکتِ روس کا ٹوٹنا اشتراکیت کی شکست نہیں، محض حربی پسپائی تھی ورنہ آج یہ فلسفہ سرمایہ داری کے مقابل مضبوط تر محاذ قائم نہ کر چکا ہوتا۔ فی زمانہ عالمی سٹیٹ آپریٹس کی حرکیات ایشیا کی اشتراکیت مائل سرزمینوں سے کنٹرول ہونے لگی ہیں۔ اسپنگلر کی کتاب زوالِ مغرب بھی یورپی ثقافت کی زوال آمادگی کا مدلل بیان ہے۔ اس کتاب میں اشتراکیت اور سرمایہ داری کی تقابلی جدلیات سے استنباط کرتے ہوئے سید محمد تقی لکھتے ہیں:

''کمیونزم یورپی تمدن کے تغیر کا آخری نکتہ ہے۔''(20)

علامہ اقبال نے بھی ایک صدی پہلے اسی یورپی تہذیب کو ''شاخِ نازک کا آشیانہ'' قرار دے کر ناپائیدار گردانا تھا مگر زوال و انحطاط کی ایسی تمام تر پیش بینیوں کے باوجود اگر یہ آج بھی روبہ عمل ہے تو اس میں قانونِ قدرت کی

پاسداری کا وہی اہتمام ضرور ہو رہا ہو گا جس کا تذکرہ مولانا مودی کے محولہ بالا طویل اقتباس کی صورت کیا گیا ہے۔ بلاشبہ سرمایہ پرستی کی حکمتِ کار آکاس بیل کی طرح دستِ دولت آفریں سے خون کشید کر کے دولت مندوں کی لذتِ کام و دہن کا سامان کرتی ہے جب کہ اشتراکیت سرمایہ و محنت میں مساویانہ ارتباط پر اصرار سے عبارت ہے، مگر اڑچن صرف یہ کہ یہاں افراد کی طبعی صلاحیتوں کے فرق اور احساسِ ملکیت جیسے نفسیاتی جذبوں کو خاطر خواہ اہمیت نہیں مل پاتی۔ اس خلا کی بھرپائی اسلامی نظامِ معیشت میں میانہ روی کے اصول سے ہو پاتی ہے۔ قوموں کی اجتماعی زندگی میں علم و حکمت کا کلیدی وظیفہ سلامت روی کا رویہ اپنانا اور اس رویے کے فروغ میں کاوش کرنا ہے۔ یہی بارگاہِ ایزدی کا سرمدی اصول ہے۔ انسانی معاشرے کے نظمِ اجتماعی کی ضمانت اگر کسی اصل الاصول میں تلاش کی جا سکتی ہے تو وہ بے ضرر زندگی کیے جانے اور بھلائی کو فروغ دینے میں مضمر ہے۔ اگر یہ نہیں تو فکر و فلسفہ اور شرح و دین سبھی انسان کی کارگاہِ فکر میں ڈھلنے والے نوع بہ نوع لات و منات ہیں۔ اپنے اپنے نظریات کو حق و صداقت کی خود ساختہ کسوٹیاں قرار دینا کارِ بے کاراں ہے۔ اچھے دنوں میں یہی نکتہ ''الدین النصیحۃ'' کی بلیغ صورت میں تسطیر ہوا تھا۔ دریائے معنی کے تہہ نشیں جواہر تک رسائی مگر عملی غوّاصی کا تقاضا کرتی ہے اور گفتار کے غازیوں کی عمل داری مگر معلوم! آج تک مغربی تہذیب کا ''شاخِ نازک'' پر اٹکا آشیانہ اگر محفوظ و مامون چلا آرہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے طائرانِ کم پَر نے بھی کچھ ضروری صلاحیتیں سیکھ کر تسخیرِ خودی کا سامان کر رکھا ہے جس سے فی زمانہ ہمارے ''طائرِ لاہُوتی'' کو بھی اکتسابِ پرافشانی کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں علامہ مذکور نے ہی فرمایا تھا:

> "During the last five hundred years religious thought in Islam has been practically stationary.There was a time when European thought received inspiration from the world of Islam.The most remarkable phenominon of modern history ,however,is the enormous rapidity with which the world of Islam is spirtually moving moving towards the west.There is nothing wrong in this movement, for Europion culture on its spirtual side is only a further development of some of the most important phases of the culture of Islam."(21)

آج کا انسان تہذیب کی مصنوعی تشکیل کرتے ہوئے جنگلی معاشرت کی طرف مراجعت کیے جاتا ہے۔ زوال عصر کی گھڑیوں کا صوتی آہنگ ''انسان خسارے میں ہے'' کا گویا ایک آفاقی لسانی کوڈ ہے۔ لہو گرم رکھنے کا ہر وہ بہانہ جو دوسروں سے حقِ حیات چھین لے، استحصالی ہے اور بنا بریں اس سے گریز واجب آتا ہے۔ کسی بھی قسم کے

تعصب کو معیارِ عدل بنا کو پیش کرنا بارگاہِ ایزدی سے مبعوث ہونے والے آخری رسول ﷺ کی تعلیمات کی من گھڑت تعبیر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تہذیب کی ہم پایہ رومن سلطنت میں مذہب کی من مانی تشریح و تفسیر اور اس کے جبری نفاذ کی سرگرمیاں عروج پر پہنچیں، تو تناسب معکوس کے طور سلطنت رو بہ زوال ہوتی گئی۔ انگریز مورخ ایڈورڈ گبن کی کتاب زوالِ سلطنتِ روما کا ماحصل اس کاٹ دار جملے کی صورت کرتے ہیں: ''میں نے مملکتِ روما کے زوال کی تاریخ میں مذہب اور بربریت کی فتح کی داستان بیان کی ہے''۔ (22)

مذاہبِ عالم کی اسی من مانی تعبیر پرستی سے اقوام و ملل میں تہذیبی تصادم کے بگل بجتے ہیں۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے میانمار (برما) میں، ہندومت والوں نے ہندوستان میں، عیسائیت کی آڑ میں نوآبادی ملکوں میں اور یہودی صیہونیوں نے فلسطین میں جو حالیہ گل کھلائے، وہ سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ ادھر اسلامیوں کے ہاں باغِ امت میں فصلِ خزاں نے ڈیرے جما لیے؛ نخلِ اسلام کی جڑوں پر دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے قاتل تیشے وار کیے جاتے ہیں اور ہم بے دھیانی اور نسیان کے قدیمی انسانی وصف کے حامل انوکھے بھلے مانس بھنبھور کی بے خبر سسّی کی طرح ان کلہاڑوں میں ٹھنسے لکڑی کے دستوں کی صورت سہولت کاری میں جُتے ہیں۔ ہمارے ملی انتشار کی قوتِ محرکہ مذہبی ہی نہیں بل کہ کثیر الجہاتی طور پر لسانی، جغرافیائی، نسلی اور قبائلی افتراکات کا ملغوبہ ہے اور ففتھ جنریشن وار فیئر میں یہی محاذ ہماری ممکناتِ جسم و جاں کی کسوٹی بن کر فکری کم عیاریوں کی غمازی کیے جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں سیاست کی بساط پر قوموں کی پیش قدمی اور پسپائی کا انحصار قمار بازوں کے بیانیہ مہروں کی لطیف حرکیات میں مستور ہے۔ کالے کاکاٹا بغدادی تریاق سے بچ رہے گا، ڈسکورس کا ڈسا مگر پانی نہیں مانگتا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور نعائمِ فطرت یعنی پانی، آگ اور ہوا کے جیسے ہی سبھی کے استفادہ کے لیے وقف بھی۔ یہ ایک ضابطۂ حیات کے طور پر مسمار فکری سرحدوں میں اپنا تشخص بنائے رکھنے اور مسائلِ حاضرہ کو خوش اسلوبی سے نبھانے کی راہ سدھاتا ہے۔ ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ قرانِ حکیم میں علم والوں کی بے عملی بالخصوص ہدفِ تنقید ٹھہری ہے:

> ''تو جن کو تورات دی گئی اور انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔'' (23)

قرانِ حکیم میں حکمت و دانش کو ''خیر کثیر'' کہا گیا ہے۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اخلاقی اقدار و روایات کو اپنا تشخص بنا کر پیش کرنے کی مسابقتی فضا نئی صف بندیوں کی صورت سامنے آ رہی ہے۔ یہاں اختلافِ رائے کے اظہاری قرینوں کے فروغ اور ایسی آراء کی روادارانہ برداشت کاری کو ایک تہذیبی قدر کے طور پر رواج

دینے کی سعی کی جاتی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور افرادِ قوم کے لیے ہر نوع کے تحفظ کی فراہمی اور ان کی کارکردگی کی یکساں قدر دانی سے مشروط ہے۔ یہاں لوگوں کو آزاد خیالی، تخلیقیت، تنقیدی سوچ، دانش ورانہ بردباری، مطابقت پزیری اور صحت مندانہ فکری مکالمے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے خود احتسابی اور ناقدانہ دروں بینی کے رویوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی درکار ہے۔ جارج آرویل کا زیرِ نظر دیباچہ بھی بہ حیثیت مجموعی برطانوی معاشرے کی ایسی ہی حکمت شعاری اور دانشورانہ بردباری (Intellectual Tolerance) کا مثیل ہے۔ جس سماج میں جذبات اور غیر عقلی عناصر سے ماوریٰ ہو کر فکری نشو وارتقا کی فضا سازگار نہ ہو وہاں تخلیقی سرگرمیاں اور تجدیدی فعالیتیں روبہ عمل ہی نہیں آپاتیں۔ آغا افتخار حسین نے اپنی کتاب قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''جس قوم کے دانش ور خود اپنی قوم پر تنقید نہیں کرتے اور دوسری قوموں کی خود تنقیدی کو ان کے زوال کا بھی پیش خیمہ سمجھتے ہیں، وہ غالباً اپنی قوم کی کوئی زیادہ خدمت انجام نہیں دیتے۔''(24)

علامہ اقبال کے خطبات ''Re-construction of religious thought in Islam'' میں جدید سماجی نظم کی بہتر تفہیم کا سامان موجود ہے۔ نئی نسل کے چشم و گوش شعوری یا لاشعوری طور پر جدیدیت کے رنگا رنگ بیانیوں اور نوع بہ نوع نظریاتی منطقوں سے آشنائی پال چکے، لہٰذا تعقلاتی فریم ورک کے تذبذب (Eporiatic Condition) میں سوال اٹھانے پر انھیں بہ نظرِ تشکیک دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ تجسّسِ قلبی کو شانت کرنے کی لپک شیوۂ براہیمی ہے اور اگر دیکھا جارہا ہے تو اپنی بے بصیرتی پر ہمیں بھی ضرور کچھ نہ کچھ حسّاسیت درکار ہے کہ قرآن ایسی لایزال کتاب کے ہوتے جدتِ افکار و کردار کی منہج کا استنباط نہ کر سکے۔ آج ریاستی سرحدیں مقرون سے زیادہ مجرد نوعیت اختیار کیے جاتی ہیں۔ ان سرحدوں سے قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے یکساں نظریات و افکار کی تشویق و ترویج کرتے ہوئے اپنے مخصوص امتیازی تشخص کو نمایاں کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ایسی ہی فکری یکسانیت پرستی سے اقوام و ملل کے قومی بیانے گھڑے جاتے ہیں جسے مقدس متن کی طرح ایک ساختیاتی جرح و تعبیر سے گزارنا گناہ کبیرہ قرار پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شخصی متون اپنی بنت کاری میں روبہ عمل ثقافتی حرکیات کے بموجب لاریب حیثیت کے حامل نہیں ہوتے اور بنا بریں اصلاح و اضافے کی گنجائش ہمیشہ یہاں معرضِ امکان میں رہتی ہے۔ فی زمانہ عمومی قاعدہ مگر یہی دیکھا گیا ہے کہ رنگ، نسل یا زبان کی بنیاد پر بنے ریاستی بندوبست میں ایسے بیانیوں سے سرِ مو انحراف بھی روا نہیں رکھا جاتا جو چند کلیدی امور کی مستثنیات کے سِوا کسی طور مستحسن نہیں۔ علامہ اقبال کی شعری دانش کے مطابق '' خاص ہے ترکیب میں قومِ

رسولِ ہاشمی ﷺ"، کیوں کہ اس میں مختلف النوع گروہی شناختوں کو ایک کلیدی عمرانی نظریے کے تحت حتی الامکان مساویانہ درجات پہ رکھنا یقینی بنایا جاتا ہے۔ یہاں اقتدارِ اعلیٰ کو خدا کی امانت سمجھتے ہوئے عوام اپنی اجتماعی دانش سے روبہ عمل لاتے ہیں۔اڑچن اس وقت در آتی ہے جب یہ الوہی اختیار جمہور سے ہتھیا کر کوئی شخص یا گروہ مذہب کی آڑ میں خود کو فاعلِ مختار کے طور پر استعمال میں لاتا اور اپنے نام کے خطبے پڑھنے پر عامۃ الناس کو مجبور کیے جاتا ہے۔ بد قسمتی سے آج اکثر مسلم ممالک میں یہی منظر نامہ رنگ جمائے ملتا ہے جہاں جبری قومی بیانیوں کے مکڑ جال، دینِ بزرگاں خوش نہ کرنے والے اہلِ نظر افراد کو مردودِ حرم ٹھہراتے اور قید و بند میں مہر بہ لب پڑے رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ایسے میں فکری آزادی کے سُوتے اَٹ جاتے ہیں اور فلاح و اصلاح کی کشتِ ویراں نقد و نظر کے نَم کو پڑی ترستی ہے۔ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو۔ یہاں دعا کا مقام ہے کہ فکر و نظر کے امکانات کو ورائے عقل تک رسائی کے قابل بناتی اور قلبِ مضطرب پر سکینہ اتارتی ہے۔احساسِ زیاں کی خلش توفیقِ عمل کی عطا سے ہی دور ہو سکتی ہے اور عمل عشق سے مشروط۔ گھ مشکوۃ داسدّا پاسا۔۔۔افکار کی راستی سے ہی صائب فیصلے نمو پا سکتے ہیں اور فیصلے درست ہوں تو اعمال بار ور ہونا لکھ دیا گیا ہے۔ فکر و نظر لیکن تبھی ٹھیک ہو پاتے ہیں اگر ان کے لیے آزادانہ پھلنے پھولنے کی فضا میسر رہے۔اسی طور جہانِ تازہ کی نمود کا انصرام معرضِ امکان میں آتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

(1) علم و فن میں پسماندہ مگر معاشی طور پر مضبوط ممالک کو "تیسری دنیا" شمار کرتے ہیں جب کہ حال ہی میں علمی و فنی پسماندگی کی ساتھ ساتھ معاشی بدحالی کے شکار ملکوں کو "چوتھی دنیا" کے ممالک کہا جانے لگا ہے۔

(2) ایک حدیث پاک ہے: "اِیَّا کُمْ وَخَضْرَاءَ الدَّ مَنْ۔اَلْمَرْأَۃُالحَسَنَاءُ مِنْ مَنَبَتِ السُّوْءِ "(خبردار! خوبرو لیکن بداخلاق عورت سے بچو، وہ تو گھورے کی گھاس ہے۔)اس مثالیے میں لفظ "دمن" سے مراد راکھ اور گوبر یا مینگنیوں وغیرہ پر مشتمل وہ باقیات ہیں جو خانہ بدوش بدوی قبائل نقل مکانی کے بعد پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔اس غلاظت پر اُگا سبزہ لق و دق صحرا میں بڑا نظر فریب لگتا ہے مگر اصلاً کثیف ہوتا ہے۔(غلام علی ، جسٹس: سیرت المختار ،(لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، س ن)، ص ۱۳۲)

(3) انتظار حسین: علامتوں کا زوال،(لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۵۱۔

(4) جارج آرویل: Animal Farm،(انگلینڈ، پینگوئن رینڈم ہاؤس)، ص ۸۶۔

(5) رولاں بارتھ: The Pleasure of the Text، مترجمہ: رچرڈ ملر،(نیو یارک: ہِل اینڈ وینگ، ۱۹۷۵ء)، ص ۹۔

(6) جارج آرویل:Animal Farm،ص۹۰۔
(7) سعید احمد،:داستانیں اور حیوانات،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص۸۹۔
(8) بے خود دہلوی، عبدالحئی، محولہ: نقوش (غزل نمبر)، مدیر: محمد طفیل، طبع چہارم، لاہور، اکتوبر 1985ء۔
(9) جارج آرویل:Animal Farm،ص۱۰۲۔
(10) میر تقی میر: کلیاتِ میر، مرتب: ظل عباس عباسی، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، طبع سوم، ۲۰۱۳ء)، ص۳۸۳۔
(11) روبی، احمد عقیل: جنگل کتھا، (لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص۱۷۔
(12) مودودی، سید ابوالاعلیٰ: بناؤ اور بگاڑ، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ)، ص۸۔
(13) خورشید ندیم: تکبیر مسلسل (کالم)، روزنامہ دنیا، ۱۴ دسمبر ۲۰۲۱ء۔
(14) مودودی، مولانا: ادبیاتِ مودودی، مرتب: خورشید احمد، (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، طبع دوم، 1985ء)، ص۱۵۸۔
(15) انوار احمد: ادب اور جمہوریت، مشمولہ: مجلّہ تدریس و تحقیق، (لاہور: ۱۵۔ دینا ناتھ مینشن دی مال، س ن)، ص۱۴۳۔
(16) امجد طفیل، ڈاکٹر: اینیمل فارم کے دیباچے کا معاملہ، مشمولہ: روز نامہ ایکسپریس، لاہور، ۳۱ / اگست ۲۰۱۵ء۔
(17) جارج آرویل Preface to Animal Farm، ص۹۹۔
(18) کشفی، ابوالخیر (مرتب): سرسید کا آئینہ خانہء افکار، (کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۸ء)، ص۱۰۱۔
(19) محمد زکریا، خواجہ: نثر اکبر الہ آبادی، (لاہور؛ مسجد ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ص۲۱۔
(20) کشفی، ابوالخیر (مرتب): سرسید کا آئینہ خانہء افکار، ص۱۰۴۔
(21) محمد تقی، سید: روح اور فلسفہ، (کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۵ء)، ص۸۵۔
(22) محمد اقبال،:Recostruction of religious thought in Islam، ص۷۔
(23) گبن، ایڈورڈ، بحوالہ: افتخار حسین، آغا: قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۴ء)، ص۲۹۳ ۔
(۲۴) افتخار حسین، آغا: قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، ص۲۳۲۔